حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

(قسط ۲)

تطلیقِ ثلاثہ

قاری عبدالحفیظ صاحب ریسرچ اسسٹنٹ ادارہ "منہاج" کے تعاقب کے جواب میں

۴ - چوتھا گروہ وہ ہے جو آپؓ کے اس اجتہاد کو (اگر یہ اجتہاد تھا ــــ تو) درست نہیں سمجھتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نص کی موجودگی میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب صحیح روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دورِ نبوی، صدیقی اور فاروقی کے ابتدائی دو تین سالوں تک کا تعاملِ امت یہی رہا کہ تین طلاق کو تین نہیں بلکہ ایک ہی شمار کیا جاتا تھا، تو پھر کسی آیت یا روایت سے بیک مجلس کی تین طلاق کے تین ہی واقع ہونے کے معنی نکالنا درست نہیں۔

اس گروہ میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو تطلیقِ ثلاثہ میں تین کے وقوع کے قائل نہیں۔ یہ لوگ آپؓ کے اس فیصلہ کو اجتہادی غلطی قرار دینے کے بجائے یہ کہنا بہتر سمجھتے ہیں کہ آپؓ کا یہ فیصلہ سیاسی اور تعزیری تھا۔ یہ گروہ دورِ فاروقی سے لے کر آج تک بلا انقطاعِ زمانہ موجود چلا آرہا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کے ایک نامور مولف محمد حسین ھیکل نے اپنی تالیف "الفاروق عمرؓ" میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"حضرت عمرؓ نے کتاب اللہ کے نص میں اجتہاد کیا تھا، جس کی آج ہم مخالفت کرتے ہیں۔ کیوں کہ نصِ قرانی کا مقصود یہ ہے کہ طلاق بالفعل ایک دفعہ کے بعد دوسری دفعہ دینے پر واقع ہو اور شوہر کے لیے دو دفعہ رجوع کا

موقع باقی رہے، کیوں کہ اس کے اثرات زندگی پر گہرے مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تین طلاقیں ہیں، تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ کیوں کہ طلاق ایک فعل ہے، جسے واقع ہونا ہے ـــــ نہ کہ قول، جسے زبان سے ادا کرنا ہے۔" (مقالات ص ۶۵)

۵۔ اور پانچواں گروہ وہ ہے جو تطلیق ثلاثہ کے قائلین اور مخالفین دونوں کو درست قرار دیتے ہوئے درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ مصر کی مطبوعہ کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کے مصنف عبدالرحمٰن الجزیری رقم طراز ہیں کہ:

(ترجمہ) لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پر (یعنی تطلیق ثلاثہ کے وقوع پر) اجماع ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ بلاشبہ مجتہدین میں سے تھے، جن پر دین کے معاملہ میں پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے، لہٰذا آپؓ کی تقلید کرنا جائز ہے ـــــ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کی ان کی رائے کے معاملہ میں تقلید کرنا واجب نہیں ہے، اگرچہ آپؓ بھی مجتہد ہی تھے۔ رہا اکثریت کا آپؓ سے اتفاق کرنا تو اس سے آپؓ کی تقلید لازم نہیں آتی۔ ممکن ہے آپؓ نے لوگوں کی تعزیر کی غرض سے اسے نافذ کیا ہو جبکہ لوگ خلاف سنت طریقہ پر طلاق دے رہے تھے۔ کیونکہ سنت یہی ہے کہ مختلف اوقات میں طلاق دی جائے۔ اور جو شخص سنت کے خلاف کرتا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ زجر کا معاملہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تین طلاقیں بلفظ واحد ایک واقع ہوتی ہے، انھیں ان کا تین کہنا معقولیت پر مبنی ہے۔ کیونکہ عہد رسالت، دور صدیقی اور فاروقی کے ابتدائی دو برسوں تک ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے جو اجتہاد کیا اس کی دوسروں نے مخالفت کی۔ لہٰذا مخالفت کرنے والوں کی تقلید بھی اسی طرح درست ہے، جس طرح حضرت عمرؓ کی تقلید درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فروعی اعمال میں کرید کر یقینی صورت معلوم کرنے کا ہمیں مکلف نہیں بنایا ہے، کیوں کہ ایسا کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔"

(کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۲۴۳ - ۲۴۴ بحوالہ مقالات ص ۶۶)

۲۔ قرآنی آیت سے قاری عبدالحفیظ صاحب کا استدلال

"فائے تعقیب" اور "ثم" کی بحث

قاری صاحب موصوف فرماتے ہیں:

"جمہور اپنے اس دعوٰی میں (یعنی ایک مجلس کی تین طلاق کے وقوع میں) قرآن پاک کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

"فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ..... اس سے متصل پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو طلاقوں کا ذکر کیا ہے "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ" اس کے فوراً بعد "فَإِنْ طَلَّقَهَا" والی آیت ہے۔ یعنی طلاقیں تو دو ہی ہیں، لیکن اگر کسی شخص نے دو طلاقیں دینے کے فوراً بعد نادانی کی بناء پر تیسری طلاق بھی دے دی تو پھر اس کی بیوی اس کے لیے حلال نہیں رہے گی، جب تک کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرفِ فا کو استعمال کیا ہے جو کہ تعقیب مع الوصل کے لیے آتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر دو طلاقیں دینے کے فوراً بعد اسی مجلس میں تیسری بھی دے دی تو تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے گی اور اب اس کے لیے بیوی حلال نہیں۔ یہاں پر اگر حرف "ثم" ہوتا، جو مہلت اور تراخی کے لیے آتا ہے، پھر معنی یہ بنتے کہ ایک طہر میں ایک طلاق، دوسرے طہر میں دوسری اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق۔ اس صورت میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک ہی واقع ہوتیں ـــــ مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔" (منہاج مذکورہ ص ۳۰۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں قاری صاحب موصوف کی دلیل کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ حرفِ "فاء" "تعقیب مع الوصل" کے لیے آتا ہے۔ ہمیں اس کلیہ سے ہی اتفاق نہیں ہے کہ ہر ہر مقام پر "فاء" "تعقیب مع الوصل" کے لیے ہی آتا ہو۔ درج ذیل آیات پر غور فرما کر بتلائیے کہ یہاں "فاء" کا حرف "تعقیب مع الوصل" کے لیے ہی استعمال ہوا ہے؟

۱۔ "قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔ الآیۃ۔" (آل عمران: ۳۱)

۲۔ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" (الم نشرح ۵۴)
۳۔ "فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ"
(البقرۃ: ۸۹)

قاری صاحب کے بیان میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ حرفِ "فاء" کے چھ مختلف استعمالات میں سے ایک استعمال بطورِ "تعقیب مع الوصل" بھی ہے ۔ اور وہ چھ استعمال یہ ہیں: (۱) ترتیب (۲) "تعقیب (مع الوصل)" (۳) سبب (۴) شرط (۵) رابطہ (۶) زائدہ ۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیت زیرِ بحث میں حرفِ "فاء" تعقیب مع الوصل کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے یا کسی اور غرض کے لیے؟ اس مقصد کے لیے ہم اس سے پہلی آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس کی طرف قاری صاحب نے بھی توجہ دلائی ہے اور وہ آیت یوں ہے:

"اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ـــــ اس کے بعد خلع کے احکام ذکر ہوئے ہیں۔ پھر اگلی آیت میں فرمایا:
"فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔ الآیۃ"

(البقرۃ: ۲۲۹-۲۳۰)

"طلاق دو بار ہے ۔ پھر یا تو ان کو شائستہ طور پر اپنے نکاح میں رکھا جائے یا بھلائی کے ساتھ رخصت کر دیا جائے ..... پھر اگر خاوند (بیوی کو) تیسری بار طلاق دے دے تو اس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے، پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔"

اب دیکھئے آیتِ مذکورہ میں "فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ" کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تین تو درکنار، دو طلاقیں بھی بیک وقت دینا اس آیت کے مفہوم کے صریح خلاف ہے۔ "فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ" کا تعلق پہلی طلاق کے بعد بھی ہے اور دوسری کے بعد بھی ۔ اندریں صورت جو تیسری طلاق کے وقت لفظِ "فاء" استعمال ہوا ہے وہ تعقیب مع الوصل کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ بالخصوص اس صورت میں کہ درمیان میں خلع کے احکام بھی بیان کیے جا رہے ہیں؟ لہٰذا ہمارے خیال میں اگر "فاء" کو "تعقیب مع الوصل" کے لیے قرار دینا ہی ہے تو کیوں نہ "فَاِمْسَاكٌۢ" کی "فاء" کو ایسا قرار دیا جائے جو "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" کے ساتھ ہی واقع ہے۔ اتنی دُور جا کر "فَاِنْ طَلَّقَهَا" کی "فاء" کو "تعقیب مع الوصل" قرار دینے کی کوئی تُک نظر نہیں آتی۔

قاری صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ "اگر 'فا' کے بجائے 'ثُمّ' کا لفظ آتا تو پھر یہ معنی بنتے کہ ایک طہر میں ایک طلاق، دوسرے میں دوسری اور تیسرے میں تیسری طلاق۔ اس صورت میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک ہی واقع ہوتیں۔ مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔" (منہاج ص۳۰۳)

گویا قاری صاحب موصوف کے نزدیک قرآن کی آیت کے مطابق طلاق دینے کی یہ شکل بالکل درست ہے کہ یک لخت تین طلاقیں دے کر انھیں تین ہی شمار کر لیا جائے۔ کیونکہ حرفِ "فا" کا یہی تقاضا ہے، اور یہ جو طلاق دینے کا شرعی طریقہ مشہور ہے کہ ایک طہر میں ایک طلاق دی جائے، دوسرے میں دوسری، تیسرے میں تیسری۔ تو طلاق کی یہ شکل قرآن کی آیت کی رُو سے درست نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت تو "ثُمّ" کے لفظ کا تقاضا تھا جو یہاں استعمال نہیں ہوا۔ اب ہم یہ بتلائیں گے کہ قاری صاحب اپنی بات کی دھن میں آکر اپنے ہی مسلک کے خلاف کیا کچھ باتیں فرما گئے ہیں؟ اس کے لیے ہمیں طلاق کی مختلف شکلوں پر نگاہ ڈالنا ہو گی۔

طلاق کی مختلف شکلیں اور ان کے احکام

طلاق کی مختلف صورتوں کی وضاحت کے لیے چونکہ عدت کا تعین ضروری ہے، لہٰذا پہلے عدت کے مسائل و احکام کی وضاحت کی جاتی ہے ـــــ اور وہ درج ذیل ہیں :

عدت کے مسائل و احکام :

(۱) بیوہ غیر حاملہ کی عدت چار ماہ دس دن ہے ۔ (البقرۃ : ۲۳۴)

(۲) بیوہ حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔ سُبیعہ اسلمیہ کے ہاں خاوند کی وفات کے تقریباً ایک ماہ بعد (مختلف روایات میں یہ مدت ۲۰ دن سے ۴۰ دن تک ہے) بچہ پیدا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اگلے نکاح کی اجازت دے دی۔
(بخاری، کتاب الطلاق)

(۳) غیر مدخولہ عورت خواہ وہ بیوہ ہو یا مطلقہ، اس کی کوئی عدت نہیں[1]۔ (الاحزاب : ۴۹)

---

[1] اس عورت کا اگر مہر مقرر ہوا ہو تو نصف مہر خاوند کو ادا کرنا ہو گا۔ اور اگر حق مہر مقرر نہ ہوا ہو تو حسبِ استطاعت کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے (۲/۲۳۶ - ۲۳۷)

(۴) بے حیض عورت، خواہ ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو یا بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے آنا بند ہو چکا ہو، کی عدت تین ماہ قمری ہے۔ (الطلاق: ۴)

(۵) مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔ (ایضاً)

(۶) حیض والی غیر حاملہ کی عدت تین قروء ہے۔ (البقرۃ: ۲۲۸) قرء بمعنی حیض بھی اور طہر بھی۔ احناف اس سے تین حیض مراد لیتے ہیں۔ جب کہ شوافع اور مالکیہ تین طہر مراد لیتے ہیں۔ اس فرق کو درج ذیل مثال سے سمجھیے کہ:

طلاق دینے کا صحیح طریق یہ ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو تو اسے طہر کے شروع میں ہی بغیر مقاربت کیے طلاق دی جائے۔ اور پوری مدت گزر جانے دی جائے، عدت کے بعد عورت بائن ہو جائے گی۔ اب فرض کیجئے کہ ایک عورت ہندہ نامی کو ہر قمری مہینہ کی ابتدائی تین دن ماہواری آتی ہے، اس کے خاوند نے اسے حیض سے فراغت کے بعد ۴ محرم کو طلاق دے دی۔ تو احناف کے نزدیک اس کی عدت تین حیض یعنی ۳ ربیع الآخر کی شام جب وہ حیض سے فارغ ہو جائے گی تو اس کی عدت ختم ہو گی۔ جب کہ شوافع اور مالکیہ کے نزدیک تیسرا حیض شروع ہونے تک اس کے تین طہر پورے ہو چکے ہوں گے۔ یعنی یکم ربیع الآخر کی صبح حیض شروع ہونے پر اس کی عدت ختم ہو گی۔

عدت کا مقصد:

عدت کے ٹھیک ٹھیک شمار کرنے پر قرآنِ کریم نے خاصا زور دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ۔

—— الآیۃ!" (الطلاق: ۱)

"اے نبیؐ، (مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے لیے طلاق دو اور اس عدت کی مدت کو گنتے رہو۔"

عدت کا شمار اس لیے اہم ہے کہ اس دوران عورت سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اسے واضح الفاظ میں منگنی کا پیغام بھی نہیں دیا جا سکتا۔

کوئی عورت عدت کے اندر اندر نکاح کرے تو وہ نکاح باطل ہوگا:

عدت کا مقصد تحفظِ نسب اور میراث کے تنازعات کو ختم کرنا ہے۔ عدت کے اندر

اندر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں ؟ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل تک ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ جس عورت کو صحبت سے پہلے ہی طلاق ہو جائے اس کی کچھ عدت نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں نہ نسب کے اختلاف کا کوئی امکان ہے نہ وراثت کے تنازعہ کا۔

خاوند کا حق رجوع :

عدت کا عرصہ عورت کو اپنے خاوند کے ہاں گزارنے کا حکم ہے۔ کیونکہ اس دوران وہ خاوند کی زوجیت میں ہوتی ہے ـــــ عدت کے دوران خاوند کسی وقت بھی رجوع کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس رجوع میں وہ اپنی عورت کی مرضی کا پابند نہیں ہے۔ نکاح کے وقت عورت کی رضامندی ضروری ہے، مگر رجوع کے لیے عورت کی رضامندی ضروری نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ ـــــ الآیۃ" (الاحزاب : ۴۹)

"اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو، تو ان عورتوں پر تمہارے لیے کچھ عدت نہیں، جسے تم پوری کراؤ۔"

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ عورتوں کا عدت گزارنا دراصل مردوں کے حقوق کی نگہداشت کے لیے ہوتا ہے تاکہ :

(۱) اگر وہ چاہیں تو عدت کے دوران کسی وقت بھی رجوع کر سکیں۔

(۲) ان کے نسب میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش نہ رہے۔ اور

(۳) وراثت کے مسائل میں الجھاؤ پیدا نہ ہو۔

لہٰذا عدت کے دوران مطلقہ عورت کا سکنیٰ اور نفقہ طلاق دہندہ پر اور وفات کی صورت میں مرد کے لواحقین پر لازم قرار دیا گیا۔

طلاق کی شرائط :

اس سلسلہ میں بخاری کی درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے :

"عن ابن عمرؓ انه طلّق امراته وھی حائضٌ علیٰ عھد رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم فقال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم مره فلیراجعھا ثمّ یمسکھا حتّی تطھر ثمّ تحیض ثمّ تطھر له ان شاء امسك بعد و ان شاء طلّق قبل ان یمسّ فتلك العدّة التی امر اللّٰه ان تطلّق لھا النّسآء" (بخاری، کتاب الطلاق)

"عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی (آمنہ بنت غفار) کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا "عبداللہ کو حکم دو کہ رجوع کرلے اور حیض سے پاک ہونے تک اپنے پاس رہنے دے۔ پھر اس کو حیض آنے دے، پھر جب حیض سے پاک ہو تو اب چاہے تو اپنے پاس رکھے اور چاہے تو صحبت سے پہلے اسے طلاق دے دے ــــ اور یہی مطلب ہے اللہ کے اس قول کا کہ عورتوں کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو"

اس حدیث سے درج ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ حیض کی حالت میں طلاق دینے پر آپؐ نے رجوع کا حکم فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا خلافِ سنّت اور حرام ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ حیض کی حالت میں طلاق دینا خلافِ سنّت اور حرام ہے، تاہم طلاق واقع ہو جاتی ہے ــــ ورنہ رجوع کے حکم کا کچھ مطلب نہیں نکلتا![۱]

۲۔ طلاق طہر کی حالت میں دینی چاہیے[۲] جس میں صحبت نہ کی گئی ہو[۳] اور بہتر یہی ہے

---

[۱] اسی طرح فقہاء یہ قیاس فرماتے ہیں کہ اگرچہ بیک مجلس تین طلاق دینی خلافِ سنت اور حرام ہے، تاہم تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں ـ قیاس کی حد تک تو ان کی بات درست معلوم ہوتی ہے، مگر اس نص کی موجودگی میں کہ دورِ نبوی اور صدیقی اور فاروقی کے ابتدائی دو تین سالوں تک ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی شمار ہوتی تھی، اس قیاس کی چنداں وقعت باقی نہیں رہتی۔

[۲] غیر مدخولہ عورت کو طہر اور حیض دونوں حالتوں میں طلاق دی جا سکتی ہے۔

[۳] بے حیض عورت کو مباشرت کے بعد بھی طلاق دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح حاملہ عورت کو بھی مباشرت کے بعد طلاق دی جا سکتی ہے، کیونکہ ان تینوں صورتوں میں عدت کا کوئی مقصد مجروح یا مشکوک نہیں ہوتا۔

کہ طہر کے ابتدا ہی میں طلاق دی جائے۔

(۳) آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو طلاق کا جو طریقہ بتلایا، وہ یہی ہے کہ صرف ایک طلاق ہی دے کر عدت گزرنے دی جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد " طَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ " کا یہی مطلب ہے۔

اب فرض کیجیے کہ عبداللہ بن عمرؓ کی اہلیہ یکم محرم سے تین محرم تک حائضہ رہتی تھیں، اور حضرت عبداللہؓ نے دو محرم کو طلاق دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ اہلیہ کو اپنے پاس روک رکھیں اور رجوع کریں۔ یہ رجوع ۴ محرم سے آخر محرم تک والے طہر میں ہی ممکن تھا۔ اور رجوع کی وجہ سے اس طہر میں طلاق نہیں دی جا سکتی تھی۔ اب دوسری طلاق کا موقعہ ۴ صفر کو حیض کے بعد اور مقاربت سے پہلے ہی ممکن تھا۔ ۴ صفر کو دی ہوئی رجعی طلاق کی عدت تین قروء گزرنے کے بعد ہی ایک طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ طلاق کا مسنون طریقہ یہی ہے اور اس طریقے کے دو فائدے ہیں:

پہلا یہ کہ عدت کے آخری وقت تک رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر بعد میں بھی فریقین رضامند ہوں تو تجدید نکاح کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

احناف کے ہاں طلاق کی اقسام:

احناف کے ہاں طلاق کی تین اقسام ہیں (۱) احسن (۲) حسن (۳) بدعی (ہدایہ اولین، کتاب الطلاق، باب طلاق السنّہ)

۱۔ احسن تو یہ صورت ہے، جسے ہم پہلے طلاق کی صحیح اور مسنون صورت کے تحت درج کر چکے ہیں۔ یعنی ایک ہی طلاق دے کر عدت گزر جانے دینا۔ صحابہ کرامؓ اسی طریق طلاق کو پسند فرماتے تھے (ابن ابی شیبہ، بحوالہ تفہیم القرآن ج ۵ ص ۵۵۷)

۲۔ حسن۔ طلاقِ حسن یہ ہے کہ ہر طہر میں مقاربت کیے بغیر ایک طلاق دے۔ یعنی ایک طہر میں پہلی، دوسرے میں دوسری اور تیسرے میں تیسری۔ اس صورت میں:

۱۔ رجوع کا حق صرف پہلے دو طہروں میں رہتا ہے، تیسری طلاق دیتے ہی حق رجوع باقی نہیں رہتا۔ حالانکہ عدت ابھی تقریباً ایک ماہ باقی رہتی ہے۔

۲۔ آئندہ جب تک عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے، پھر وہ دوسرا خاوند یا تو

مرجائے یا اپنی مرضی سے بغیر کسی سازش یا دباؤ کے طلاق دے دے، زوجین کے باہمی نکاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اس قسم کی طلاق کو عموماً شرعی طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پیر کرم شاہ صاحب ازہر نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ یہی ہے کہ ایک ایک طلاق ہر طہر میں دی جائے۔ "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ..... الخ" (مقالات ص ۲۲۹)

ہم حیران ہیں کہ جو طریقہ خود اللہ تعالیٰ بتلائیں وہ تو حسن ہو اور احسن طریق اس کے بجائے کچھ اور ہو، یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

مولانا مودودی مرحوم جو غالباً حنفی ہونے کے ناطے سے ایک مجلس کی تین طلاق ہی واقع ہونے کے شدت سے قائل نظر آتے ہیں، انھوں نے بھی اس طریقِ طلاق پر یہ تبصرہ فرمایا کہ:

"اس صورت میں تین طہروں میں تین طلاق دینا بھی سنّت کے خلاف نہیں ہے۔" (تفہیم القرآن ج ۵ ص ۵۵۷) "اور مالکیہ ایسی طلاق کو بدعی مکروہ کا نام دیتے ہیں (تفہیم القرآن: ایضاً)

میری معلومات کے مطابق تین طہروں میں تین طلاقیں پوری کرنے کا طریقہ طلاق کسی مرفوع حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ ابوداؤد میں جو حدیثِ رکانہ مذکور ہے اس کے آخر میں یہ ذکر ضرور آتا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ یہ رائے رکھتے تھے کہ تین طہروں میں طلاقیں دی جائیں۔ اس حدیث کے راوی بھی حضرت ابنِ عباسؓ ہی ہیں، جو فرماتے ہیں کہ رکانہؓ بن عبدِ یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالیں تو وہ آپؐ کے پاس گئی — آپؐ نے رکانہؓ کو بلا کر پوچھا "طلاق کیسے دی؟" انھوں نے کہا "تینوں طلاقیں"۔ آپؐ نے پوچھا "ایک ہی مجلس میں؟" انھوں نے کہا "ہاں"، آپؐ نے فرمایا "تو یہ ایک ہی ہوئی، اگر چاہو تو رجوع کرلو"۔ اسی حدیث کے آخر میں حضرت ابنِ عباسؓ کی یہ رائے مذکور ہے۔ (یہ حدیث آگے تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث آئے گی)

۳ — بدعی طلاق بدعی یہ ہے کہ کوئی شخص (۱) بیک وقت تین طلاق دے دے (۲) یا ایک طہر کے اندر الگ الگ اوقات میں تین طلاق دے یا (۳) حالتِ حیض میں طلاق دے یا (۴) ایسے طہر میں طلاق دے، جس میں وہ مباشرت کر چکا ہو۔ ان میں سے جو فعل بھی کرے گا، گنہگار ہوگا۔

(جاری ہے)